بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

اللہ تعالیٰ کے نام پر وقف شدہ ایک ایسی عالی شان مسجد جو مسلمانوں کی گنجان آبادی میں گھری ہو، اس کے برسوں مقفل رہنے کے بعد اگر اللہ کا کوئی بندہ اس کے منارے سے اذان کہے، لیکن پھر بھی اقامتِ صلوٰۃ نہ ہو سکے، امام غائب ہو اور نمازی عنقا، تو گویا طاغوتی قوتیں مؤذن کو ماحول کی زبان سے اذان کا یہ جواب دیتی ہیں کہ اس آبادی کو ہم مکمل طور پر تسخیر کر چکی ہیں، اور یہ تمہاری پکار کے حق میں ایک قبرستان کی حیثیت رکھتی ہے۔ زندوں کے اس قبرستان میں روحوں پر جذام اور قلوب پر فالج وارد ہو چکا ہے۔

اس تمثیل کی قندیل اٹھائیے دنیائے حقیقت میں آئیے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ ایوانِ قوت سے غلبۂ اسلام کی صدا بلند ہوئی، مگر جواب اس کا بہ حیثیت مجموعی یہ ہے کہ ؎

یہ ناداں گر گئے سجدے میں جب وقتِ قیام آیا

ایک بار پہلے بھی پاکستان کی دستور ساز اسمبلی سے ایسی ہی آواز اٹھی تھی، مگر اس کا انداز دوسرا تھا۔ اس وقت کے قراردادِ مقاصد پاس کرنے والے حضرات سیاست کی جس بازی شطرنج کو کھیلنے کھیلتے یکایک خدا کی حاکمیت اور قانونِ شریعت کا نعرہ لگا گئے تھے، پلٹ کر پھر اسی مہرہ بازی میں محو ہو گئے۔ اس وقت روحِ پاکستان یوں نالہ کش ہوئی کہ ؎

قراردادِ مقاصد کے تم مصنف تھے

یہ صور پھونک کے اب کھو گئے کہاں آخر

صفِ نماز کھڑی ہے بہ انتظارِ امام
اذان پکار کے خود سو گئے کہاں آخر

مگر اب معاملہ دوسرا ہے۔ اب جواب دہی کا بار بہ حیثیت قوم ہم پر آ پڑا ہے!

صورتِ حال بڑی پُراسرار معلوم ہوتی ہے۔

آج واقعہ یہ بھی نہیں کہ قوم بے حس اور جمود زدہ ہو۔ جنوری ۱۹۷۷ء سے نظامِ مصطفیٰ کے سرمستانِ جنون جب ایک بار اٹھ کھڑے ہوئے تو در و دیوار اور دشت و بن ان کے والہانہ جذبات کی لمعانی سے جگمگا اٹھے۔ پھر وہ وقت آیا کہ سڑک سڑک پہ لہو، اور چوک چوک میں لاشیں۔ ہسپتالوں میں زخم خوردۂ فسطائیت کے ہجوم، اور جیلوں، حوالاتوں، تھانوں اور سی آئی اے کے اڈوں میں سرگشتگانِ عشقِ محمدؐ کے انبوہ!

قائدینِ اتحاد کا اشارہ رات کو ہوتا ہے کہ کل ہڑتال ہوگی۔ مختصر نوٹس اور کم ذرائعِ اشاعت و ترسیل کے باوجود اگلی صبح کو پورے پاکستان میں مکمل ہڑتال ہو جاتی ہے۔ لیڈر رکھتے ہیں کہ چھ چھ افراد ہر روز گرفتاری دیں۔ شہروں، قصبوں اور بڑی دیہاتی آبادیوں میں چھ چھ افراد روزانہ نکلتے ہیں اور کسی مسجد میں تقریر کے بعد گرفتاری پیش کرتے ہیں۔ مگر یہ گرفتاری بھی معمولی قسم کا سیاسی کھیل نہیں۔ زہریلی گیس کے گولے اٹھتے ہیں اور لاٹھیوں گولیوں کی بارش ہوتی ہے۔ مگر کیا مجال کہ "سخاک و خون غلطیدن" کا یہ سلسلہ کہیں ٹوٹ گیا ہو۔ پھر شہر بہ شہر اور قصبہ بہ قصبہ علماء میدان میں نکلتے ہیں، وکلا کی صفیں آگے بڑھتی ہیں، نوجوان طلباء کا سیل اُمڈتا ہے اور درندگی اُن کا استقبال کرتی ہے۔ حالات کا شدید بگاڑ دیکھ کر پردہ دار خواتین، چھوٹی چھوٹی بچیاں اور ضعیف و مریض مائیں تک برقعے اور آنچل اوڑھے اپنے آپ کو ظلم و قساوت کی قوت کے سامنے لاکھڑا کرتی ہیں ——— اور اقتدار کی پستیٔ فطرت کی حد یہ ہے کہ وہ پوری قوم کے اس مقدس سرمایۂ حیا و عفت کے سامنے زنانِ بازاری کو پولیس کی وردی پہنا کر شریف عورتوں کو ان سے فحش گالیاں دلواتا اور پٹواتا ہے۔

مگر مظلومیت کا یہ کاروانِ بلاکش و بلاخیز نہ کہیں پیچھے ہٹتا ہے، نہ رُکتا ہے۔

تاریخِ سیاسیات میں مشکل ہی سے کوئی نظیر ایسی ملے گی کہ دو ڈھائی ماہ تک اتنی پُر زور اور وسیع اجتماعی تحریک چار چھ دن سے زیادہ چلی ہو، اور ایسی نظیر بھی کہیں نہ ملے گی کہ ہر روز بے حساب قربانیاں دیتی ہوئی ایسی تحریک کے باوجود صنم خانۂ اقتدار کا صنمِ چیف پروہت اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہو۔ سیاسی ڈھٹائی کی ایسی ردی مثال دُنیا کی کسی گھٹیا جمہوریت میں بھی نہ ملے گی۔ پاکستان کی سرزمین عجائبات میں جہاں اور کئی بے مثل حوادث دیکھنے میں آتے ہیں وہاں اس آخری کرشمۂ فسطائیت کا ظہور بہت زیادہ غیر معمولی نہیں! غلام محمد اور سکندر مرزا سے لے کر یحییٰ خاں اور اس کے بعد بھٹو تک قاہری و ساحری کے ادوار میں ہم نے کٹھ پتلیوں اور بازی گروں کے وہ وہ کرتب دیکھے ہیں کہ بار بار خدا یاد آیا۔

خیر، اب قوم پوچھتی ہے کہ ہمارا کیا قصور؟ ہم نے سیّدنا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے عملاً نافذ کردہ نظامِ اسلامی کے لیے تن من دھن کی بازی لگانے میں کیا کسر چھوڑی، ہمارے جوانوں نے سینوں پہ گولیاں کھائیں، ہمارے بوڑھوں نے لاٹھیوں سے سر و سینہ پہ زخم لیے، ہماری مستورات کے گلے زہریلی گیس کے مرغولوں نے گھونٹے، ہمارے کاروبار تباہ ہوگئے، قید اور مقدمے اور سزائیں اور قلعے کی ماریں ہم نے خندہ پیشانی سے قبول کیں۔ پھر اسلام کے نظامِ عدل و رحمت کی منزل کیوں دُور ہے؟ کیوں دُور تر ہوتی جا رہی ہے؟

یہ درد بھرا سوال آج پاکستان کی فضائے تاریخ میں چاروں طرف پھیلا ہوا ہے اور مجھے بارہا محسوس ہوا کہ جیسے یہ سوال کبھی ایک نیزہ بن کر سینے میں اُتر جاتا ہے، کبھی نشتر بن کر کلیجے میں چھید کرتا ہے، کبھی برقی رو بن کر دماغ کے ذرات میں جھنجھناہٹ پیدا کرتا ہے، یہ سوال ہر سوچنے والے صاحبِ دل سے اپنا جواب مانگتا ہے۔

زخم رسیدگانِ ملت اور سرگشتگانِ حق سے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس کا جواب بالکل سامنے ہے۔

دورِ غلامی میں غیر ملکی اور مخالفِ اسلام اقتدار نے یہاں اپنے مشن کے تحت سب سے اہم کام یہ انجام دیا کہ سیکولرازم کی زہریلی فصل دلوں اور دماغوں کی کھیتیوں میں بوئی۔ اس نے ایک دنیا پرست، قوت پرست، دولت پرست اور خواہش پرست طبقے کو پروان چڑھانے میں بہترین قابلیتیں اور کاوشیں صرف کیں۔ تعلیم کے ذریعے، لٹریچر کے ذریعے، مغربی فلسفے پر مبنی علوم کے ذریعے، مستشرقین کی تحقیقاتوں کے ذریعے، اسلام کے متعلق پادریوں کی یاوہ گوئی کے ذریعے، مغالطہ انگیز مناظروں کے ذریعے،

اخباری پروپیگنڈے کے ذریعے، ثقافتی اشغلوں کے ذریعے، عہدوں اور نوکریوں کے لالچ کے ذریعے خطابات اور درباری اعزازات کے ذریعے، کونسلوں کی ممبریوں کے ذریعے، ترقی کے مخصوص تصور کو عام کرنے کے ذریعے اور قوانین اور پالیسیوں کے ذریعے ایک مہم اس غرض سے چلائی گئی کہ اوّل تو اعلیٰ ذہانت کے نوخیز افراد کے دلوں میں الحاد اتنا کارفرما ہو جائے کہ اسلام کی دبی دبائی کوئی جڑ باقی نہ رہے، یہ نہیں تو پھر اتنا ضرور ہو کہ اسلام کا نام تو باقی رہے مگر زندگیوں کے ساتھ اُس کا کوئی تعلق نہ ہو۔ اور یہ بھی نہ ہو تو بدرجہ آخر لیڈری، ملازمت، تجارت و معیشت اور فنون و ثقافت اور تمام اجتماعی معاملات کا دائرہ اسلام کے لیے ممنوع الدخول ہو جائے اور کوئی محدود و بے ضرر قسم کی ذاتی اسلامیت کو جاری رکھنا چاہے تو کرتا رہے۔ سیکولرازم کا سیلاب ایسی مذہبیت کو اپنے ساتھ لڑھکاتا جائے گا تاآنکہ اس کے ٹکڑے اور ذرات آہستہ آہستہ بکھر جائیں گے۔

یہ اسکیم مطلوبہ معیاری حد تک نہ سہی، مگر بے حد مؤثر ثابت ہوئی۔ خاص طور پر بیرونی مسلم دشمن طاقت نے اس پہلو سے اپنا اصل زور سیاسی قیادت اور سول سروس پر صرف کیا۔ یہاں تک کہ جب وہ آزادی دے کر رخصت ہوگئی تو ہمارے ہی اندر کا سیاست کار طبقہ اور ہماری ہی اپنی سول سروس کی مشینری کے پرزے سیکولرازم کے قلعے کے محافظ بن کر چاق وچوبند ہوگئے۔ سیاست کاروں کو تو کچھ نہ کچھ عوامی رجحانات کا خیال کرنا پڑتا تھا لہٰذا انھوں نے بہ حیثیت مجموعی منافقت کو بہترین حربہ پاکر اُسے خوب خوب استعمال کیا۔ پُرزور قصیدہ خوانی اسلام کی، اور معاملات کا نہج لادینی۔ بلکہ ایسے ایسے شہسوار اس میدان میں نمودار ہوئے کہ اسٹیج پر اسلام کے شیدائی و فدائی، اور ایوانِ حکومت میں اسلام کے چہرے کو مسخ کرنے اور اسلام کو بے دست وپا کرنے کے لیے کچھ ویسا ہی کردار، جیسا شاہی قلعۂ لاہور کے محافظانِ امن و نظم کا اپنے کسی شکار کے ساتھ ہوتا ہے۔ ان کو پشت پناہی سول سروس کے خاصانِ خاص سے ملتی رہی۔ دنیا کی ہر سول سروس میں بڑی تعداد توکولھو کے بیلوں کی ہوتی ہے، پھر ہمارے یہاں کچھ سادہ دل اور شرفا بھی خدمتِ قوم کا درد لیے اس کوچۂ ملامت میں جا نکلتے ہیں۔ وہ بیچارے یا تو ساری عمر گرامر کے فعل کی ایک ہی قسم یعنی سہنے (اور بھگتنے) سے دوچار رہتے ہیں، یا اگر سول سروس کی لکیر کی فقیری کرنے میں ہیر پھیر کریں تو کسی الزام کا نشانہ بن کر یا بلاکسی تہمت کے، پالے سے باہر کر دیے جاتے ہیں۔ سول سروس کی اصل قوت وہ چند با اختیار اور ذہین و فطین لوگ

ہیں جو ایوانِ اقتدار میں آنے والی مختلف شخصیتوں اور متضاد قوتوں کے ساتھ ایسا تال میل پیدا کر لیتے ہیں کہ ہر نوگرفتارِ اقتدار ان میں سے کسی بھی شخص کے متعلق یہ سمجھتا ہے کہ کھرا سونا اور سچا ہیرا تو اب ہاتھ آیا۔ آنے والا اوّل تو اپنے نظریات و مقاصد کو غیر شعوری طور پہ ان سے ہم آہنگ کر لیتا ہے، لیکن اگر سول سروس کے خاص اساطین یہ محسوس کریں کہ اس شخص کے زہریلے دانت توڑے یا نکالے نہیں جا سکتے تو وہ ایسا چکر چلاتے ہیں کہ خود اس شخص کو توڑ کے رکھ دیتے ہیں یا نکال کے باہر پھینکوا دیتے ہیں۔ سیاست کاروں کے بخلاف، سول سروس کے جغادری کارپرداز سیکولرازم کے قلعے کی برجیوں میں بیٹھتے ہیں اور ہر حملہ آور سے — خواہ وہ جنابِ اسلام ہی کیوں نہ ہوں — بڑی خوبصورتی سے عہدہ برآ ہوتے ہیں۔

یہ لوگ اہم اور مؤثر محکموں اور اداروں کے اندر کمین گاہوں اور تہ خانوں میں جگہ بناتے ہیں۔ سیکولرازم کے ان محافظوں کا آپس میں خصوصی رابطہ رہتا ہے۔ سیاسی قوت کے لیے ان کا اوّلین حربہ خوشامد ہے — خوشامد عام قسم کی نہیں، بلکہ نہایت نستعلیق قسم کی، پُرخلوص دکھائی دینے والی، محتاط خوشامد[1]! خوشامد کے ساتھ دوسرا ہتھیار خوف دلانے کا ہے۔

ان دو قوتوں کے درمیان ایک تیسری قوت پیدا ہو جاتی ہے، اور وہ ہے خیانت! اس طرح تثلیث مکمل ہو گئی — خوشامد، خوف، خیانت!

سول سروس کے چند خاص شاطرانِ پسِ پردہ کے علاوہ تعلیم، صحافت، ذرائعِ ابلاغ، نشریاتی اور ثقافتی اداروں اور ادب و فنون کے مختلف دائروں[2] میں سیکولرازم کے محافظ اور سنتری ایسی جگہوں پہ قابض ہوتے ہیں جہاں سے وہ کچھ برقی بٹنوں پہ انگلیاں رکھتے ہیں اور دُور کہیں کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ یوں سمجھیے کہ ملک بھر میں ایک جالا سا تنا ہوا ہے اور خاموشی سے بہت سے مکڑے مکڑیاں تاریک گوشوں میں دبک کر

---

[1] دنیا بھر کے اہم ممالک کی سول سروس کا فارمولا یہ ہے "YES SIR ..... BUT SIR ....."۔ "یس بٹ" کے بعد یہ لوگ ایسا منتر پڑھتے ہیں کہ بڑے بڑے اہلِ خودی ڈھیر ہو جاتے ہیں۔

[2] فوج کے متعلق اس معاملے میں میری معلومات صفر ہیں۔ کچھ معلوم نہیں کہ آیا وہاں بھی سیکولرازم کے محافظین اسی طرح نفوذ یافتہ ہوتے ہیں یا نہیں۔

اس جال کے نئے نئے تار بنا کر پھیلا رہے ہیں۔

قوم کے نوجوان جب سینوں پر گولیاں کھا رہے تھے اور بوڑھوں کے سروں پر لاٹھیاں برس رہی تھیں اور خواتین گیس کے طوفان میں گھری ہوئی تھیں تو اُس وقت بھی یہ مکڑے مکڑیاں اپنا کام کر رہے تھے۔ بھٹو صاحب تخت سے اُتار دیے گئے، مگر ان مکڑوں اور مکڑیوں کی راجدھانی برقرار رہی۔

اسلام اُس وقت قوت پا سکے گا، جب سیکولرازم کے باڈی گارڈز میں سے ایک ایک کو کوئی بصیرت مند مرد مجاہد اگر ختم نہیں، تو بے اثر اور بے وزن اور بے وقعت کر کے ایک طرف ڈال دے گا۔ یہاں تک کہ مادہ پرستانہ نظریات کی ایجنسیاں ختم ہو جائیں اور بیرونی تہذیب و ثقافت کی اسمگلنگ کرنے والوں کی چور بازاری کا سلسلہ ٹوٹ جائے۔

سول سروس اور ذرائع نشر و ابلاغ کے دائروں میں نفوذ یافتہ گرگانِ باراں دیدہ کے ساتھ ایک اور قوت بڑا اہم پارٹ ادا کرتی ہے۔ یہ ہوتے ہیں ٹکنیکل ماہرین۔ ظاہر بات ہے کہ ٹکنیکل ماہرین کے تعاون کے بغیر کوئی بھی اسکیم نہیں چل سکتی۔ ٹکنیکل ماہرین — وہ اقتصادیات سے متعلق ہوں، بنکنگ اور انشورنس سے متعلق ہوں، یا تعلیم یا کسی اور شعبے سے متعلق — انہیں سیکولر نظامِ تعلیم نے جو مواد رٹایا ہوتا ہے، اور پھر سیکولر انتظامیہ میں پرزہ بن کر رہنے کی وجہ سے جو تجربات اُن کے دماغوں پر لد جاتے ہیں ان کی وجہ سے ان کی شخصیتیں ایک خاص سانچے میں ڈھل کر منجمد ہو جاتی ہیں۔ ان میں سے جن خوش نصیبوں کے دلوں میں ایمان کی کرنیں اُٹھتی بھی ہیں۔ وہ بھی اپنے مخصوص طور اور اصطلاحات (TERMS & TECHNIQUE) کی گرفت سے نہیں نکل سکتے۔ ان میں نئے نہج سے نئے اصولوں پر کام کرنے کے لیے تخلیقی ذہن ہی موجود نہیں ہوتا۔ اور پھر ان میں دبنگ قسم کے کچھ لوگ دَورِ حاضر کے نظریات و تحریکات کے آلۂ کار ہوتے ہیں۔ آپ جب ان کے سامنے اسلامی مقاصد کے لیے ادارات اور عوامل میں کسی اہم تبدیلی کا کوئی آئیڈیا رکھتے ہیں تو وہ ٹکنیکل مہارت کے مقامِ بلند سے اس کا بڑی عرق ریزی سے جائزہ لینے اور بحث و تحقیق کرنے کے بعد اعلان کر دیتے ہیں کہ یہ چیز تو ناقابلِ عمل ہے۔ فنی مہارت کے سامنے ہر کسی کو سرِ تسلیم خم کر دینا پڑتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں ٹکنیکل ماہرین جہاں خود بیشتر سیکولرازم کے اسیرِ قفس ہوتے ہیں، وہاں انہیں یہ ٹکنیکل مہارت بھی حاصل ہوتی ہے کہ نظامِ رائج کے سیکولر قفس سے بڑے سے بڑے اہلِ عزیمت کو بھی نہ نکلنے دیں وہ دلائلِ محکم کے ساتھ یہ یقین دلاتے ہیں کہ جہاں یہ قفس ٹوٹا، اور ہم نے باہر کی فضا میں پرواز کی، سب کچھ

تہس نہس ہو جائے گا۔

مثلاً آپ ٹکنیکل ماہرین کو بٹھا کر پوچھیں کہ جامعۂ خواتین کا وجود ممکن ہے؟ اور ممکن ہے تو اس کے امتیازات کیا ہونے چاہئیں؟ یا پوچھیے کہ تعلیم میں اسلامی انقلاب کیسے واقع ہو سکتا ہے؟ یا دریافت کیجیے کہ بلا سود بنک کاری قابلِ عمل ہے یا نہیں؟ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ ان میں سے ہر سوال پر غور ہوگا، مطالعہ ہوگا، تحقیقی کام ہوگا، میٹنگز ہوں گی، ان میں بڑی دردمندی اور سنجیدگی سے بحثیں ہوں گی، لیکن آخری نتیجہ یہی ملے گا کہ یہ کچھ تو ممکن نہیں ہے۔

اور کوئی نان ٹکنیکل دماغ قابلِ عمل راستے نکال بھی سکتا ہو تو یہ حضرات اسے خاص ٹکنیکل اصطلاحات اور مروجہ فارمولوں کے پتھروں سے ایسا مضروب کریں گے کہ بات کرنا مشکل ہو جائے۔

ان سے کام لینے کا صرف ایک طریقہ ہے۔ کوئی انقلابی ذہن کی قیادت ہو، وہ تخلیقی تفکر و تدبّر سے کام لینے والے قابلِ اعتماد دو چار افراد سے ذاتی سطح پر مشورہ لے، اور پھر ایک طے شدہ امر ٹکنیکل ماہرین کے سامنے رکھ دے کہ فلاں کام فلاں اصول و مقاصد کے ساتھ، فلاں نہج سے، اتنی مدت میں کرنا ہے۔ آپ اپنی ٹکنیکل مہارت استعمال کر کے ایک عملی بلیو پرنٹ بنا دیں۔ اگر اس کی صلاحیت نہ ہو تو مشورہ یہ ہے کہ آپ چھٹی کریں۔

خالص لادینیت اور کھلے کھلے سوشلسٹی الحاد کے سرپرستانِ خاص تو ذرا کم تعداد میں ہیں، ان کے ساتھ بہت سی تعداد مغرب پرستوں، اباحیت پسندوں اور بندگانِ مفاد کی شامل ہے۔ جب کبھی اسلام کی آمد کا خطرہ رونما ہو تو یہ سب مل کر ایک زیرِ زمین محاذ بنا لیتے ہیں۔ اوپر سے دیکھیے تو سب اچھا نظر آتا ہے۔ کسی بِل کو کھود بیٹھے تو اندر ہی اندر دُور تک سرنگیں چلی جاتی ہیں اور ان میں جابجا کیمپ لگے ہوئے ملتے ہیں۔ الحاد پسند معاندینِ اسلام کے پیچھے پیچھے جن اسلام گریز لوگوں کی صفیں دکھائی دیتی ہیں، وہ عوامی رجحانات کے زیرِ اثر اسلام کی بات پر آمین تو کہہ دیتے ہیں، مگر وہ اسلام کا ایسا ایڈیشن چاہتے ہیں کہ جو اُن کی زندگیوں میں کوئی گڑبڑ نہ پیدا کرے۔ ان کا مطلوب "سیکولر اسلام" ہے۔ یعنی رشوت، ملاوٹ، اسمگلنگ، ناپ تول کی خرابی، قیمتوں کی زیادتی، قانون شکنی، سرکاری املاک میں تصرفِ ناروا، (باقی بر صفحہ ۴۴)

(بقیہ اشارات) ٹریفک رولز کی پامالی، محاصل میں خیانت، سود کا لین دین، عریانی و فحاشی، رقص و سرود کی مخلوط ثقافتی مجالس، جنسی غلاظت کی نمائش، شراب خانوں کی گردشِ جام وغیرہ سب کچھ برقرار رہے ——— حتیٰ کہ چوری چکاری، اغوا، زنا، قتل، جیب تراشی، رسہ گیری جیسے مشاغل کا بھی مؤثر انسداد نہ ہونے پائے۔ بعد ازیں نظام مصطفےٰ آئے یا اسلامی قوانین کے اجراء کے لیے کوئی کونسل اور کوئی تحقیقی ادارہ بنے ———— ممالک اسلامیہ کی کوئی کانفرنس ہو جائے، سیرت پر کوئی بین الاسلامی سیمینار منعقد کر دیا جائے، حج کی سہولتیں بڑھا دی جائیں، مساجد اوقاف کے زیر انتظام آ جائیں، کچھ لوگوں کو تازیانے بھی لگ جائیں تو چشم ما روشن، دل ماشاد ——— آخر ہم بھی تو مسلمان ہیں۔

اب تک کے تجزیے سے یہ واضح کرنا مطلوب ہے کہ معاشرے میں سیکولر اسلام کی بڑی منڈی موجود ہے اسی منڈی کی مانگ کو سامنے رکھ کر کسی نے ختم نبوت کے بند دروازے میں رخنہ پیدا کیا تاکہ ہاتھ آگے بڑھا کر حسب ضرورت اندر کے محفوظ شدہ احکام و مقاصد میں ردّ و بدل کیا جا سکے۔ کسی نے آیاتِ قرآنی کے صحیح مفہوم پر سے سنت کے پہرے کو ہٹا کر موقع پیدا کرنا چاہا کہ نو بہ نو مفہوم قرآن میں ڈالے جا سکیں۔ کسی نے ماڈرن اور ترقی پسند اسلام کا سلوگن وضع کیا تاکہ اسلام کو غالب نظریات اور تہذیبوں کے سانچے میں ڈھالا جا سکے۔ اور کسی نے یہ تجربہ کیا کہ نعرۂ تکبیر بلند کر کے ہی اسلام کے گلے پر چھری پھیری جائے۔ آخر میں تو نوبت اسلامی سوشلزم تک پہنچی۔ کیا بعید کہ ہمارے ذہین و فطین سیاست بازوں میں کوئی ایسا بھی چھپا بیٹھا ہو جو اسلامی کفر کی ترکیب بھی ایجاد کرنے کی جسارت رکھتا ہو۔

بیرونی قوتیں ایسے عناصر کی ہمیشہ سرپرستی اور پشت پناہی کرتی ہیں۔ جب کوئی شخص اسلام کے چہرے پر پتھر کھینچ مارتا ہے تو یہ قوتیں کبھی درپردہ اور کبھی علانیہ پکار اٹھتی ہیں کہ شاباش تم نے جدیدیت اور ترقی کے تقاضوں کے پورے عرفان سے کام لے کر ایک شاندار کارنامہ انجام دیا ہے۔ اسی طریقے سے قدامت پسند رجعتی عناصر کو شکست دے کر عظیم پاکستانی قوم کو تم نئے تقاضوں کی تکمیل کے قابل بنا سکو گے (اور ہمارے نظریاتی اور تہذیبی پھندوں میں عوام کی گردنیں پھنسا سکو گے)۔

لیکن اب تک کی تاریخ کا ایک سبق نوشتۂ دیوار ہے۔ جو لوگ اسے نہ پڑھ سکے ہوں، ایک بار وہ

بھی پڑھ لیں۔

ہم لوگ برصغیر میں طویل بادشاہتی دَور میں سے گزرے، پھر سنگین اور ہولناک غلامی سے بھی دوچار ہوئے، پھر برہمنی مہاجنی سازشوں کا بھی ہم نے سامنا کیا، پاکستان میں کرسیوں کی جنگ، الاٹمنٹوں کی رسّہ کشی اور محلاتی سازشوں کا مزا بھی ہم نے چکھا، پھر سکندر مرزا ہماری تقدیر سے کھیلے۔ پھر ہم نے صدر ایوب کا دَورِ آمریت دیکھا (جو پچھلے پانچ سالہ تجربات کے مقابلے میں غنیمت معلوم ہوتا ہے)۔ پھر یحییٰ خاں آئے، پھر بھٹو صاحب جمہوریت کے لیبل کے ساتھ خوفناک ترین فسطائیت ہمارے سامنے لے کر آئے، اور انھوں نے قوم کی اخلاقی حالت اور معاشی حالت دونوں ہی کو دیوالیہ پن تک پہنچانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

آپ سوچیے کہ یہاں لوگوں نے کیا کیا سازشیں اور جبر وستم اور خیانتیں کر کے دو دو چار چار سال کی حکومتیں چلائی ہیں، اور تخت سے ہر شخص کو بادلِ نخواستہ اُترنا پڑا ہے۔ اور جو بھی اُترا، اس کا نام جیسے صفحۂ تاریخ سے باقاعدہ قلم زد کر دیا گیا ہو۔ ہر کوئی "اتراشحنہ مردک نام" بن کر رہ گیا۔ ان کے خوشامدی وزرا بکھر گئے، اُن کی سیاسی پارٹیاں درہم برہم ہوگئیں۔ ان کے خاص الخاص فدائی احباب آس پاس سے غائب ہوگئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کچھ کیڑے بھنگے تھے جنھیں حوادث نے جھاڑو کی ایک جنبش سے خس وخاشاک کے ساتھ قصرِ تاریخ سے باہر پھینک دیا۔

ان سارے طوفانی اور بحرانی حالات سے گزرنے والی قومِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے عوام ہزار خرابیوں اور کمزوریوں اور لغزشوں میں مبتلا ہوئے ہوں (اور ہر قوت نے ان کو ایمانی اور اخلاقی لحاظ سے پستی میں دھکیلنے کی بھرپور کوششیں کی ہیں) لیکن ان کے دلوں میں اپنے اسلاف کی قربانیوں، ان کے کارناموں اور کرداروں کی درخشانیوں، اور اُن کے علوم اور تصانیف اور تلقینات کی تابانیوں نے اس ٹمٹماتے بیتاب کی شمع کو برابر روشن رکھا کہ خدا کا دین جلوہ فرما ہو اور قانونِ حق نافذ ہو۔ اسی شمع کو ماضی قریب میں مولانا محمد علی جوہر اور علامہ اقبال جیسی شخصیتوں نے روشن تر کیا، اور آج اس سرزمین پر بھی اور عالمِ اسلام کے دوسرے گوشوں میں بھی ایسی بے پایاں تحریکیں پھیل رہی ہیں جن سے وابستہ صدہا افراد دن رات اسی شمع کو جلانے میں محو ہیں۔ ہر روز کتنے ہی نئے سینوں میں یہ چشمۂ نور جاری ہو جاتا ہے۔

یہ وہ قوت ہے جو ایک بار قائداعظم کی رہنمائی میں چلنے والی تحریکِ پاکستان میں نمودار ہوئی۔ اسی قوت

کے زیر اثر تاریخی قرارداد مقاصد بنی اور اسلامی دستور کا ڈھانچہ وجود میں آیا۔ پھر جہاد ۱۹۶۵ء میں سمندر کی تہہ سے اُٹھ کر یہ طوفان سطح پر آگیا۔ پھر یہی وہ قوت تھی جو تحریک ختم نبوت کی شکل میں تاریخ کا ایک حصہ بن گئی، اور آج ایک بار پھر یہی قوت ہے جو ہمارے سامنے نمودار ہے۔

اس قوت کی نفی کرنے والے اور اس کے تقاضوں کو عمل میں نہ لانے والے یکے بعد دیگرے سیاسی طور پر مٹ مٹا گئے۔ اب پھر ایک موقع ہے کہ اُمتِ محمّدیہ کی دیرینہ تمناؤں کے بے تاب کی ہُنڈی کو کیش کر دیا جائے قبل اس کے کہ جمہوری حکومت وجود میں آئے۔ خواص اور عوام، سیاسی لیڈر اور سول سروس، معلم اور سپاہی، مزدور اور کسان، صحافی اور ادیب، نیز مائیں اور بہنیں پہلے سے متنبہ رہیں کہ خدا و رسولؐ کا بہت بڑا قرضہ آپ پر واجب الادا ہے۔ تہیہ کر لیں کہ اسے ادا کرنا ہے۔ ورنہ جو بھی قیادت اُبھرے گی اور جو بھی حکومت آئے گی اس کا مقدر پچھلی تاریخ میں سیاسی اسٹیج پر آنے والے نت نئے کرداروں سے مختلف نہ ہوگا۔

سیکولرازم اور سیکولر اسلام کے باطل اصنام پر کتنے وقت، کتنے خون، کتنی جانوں، کتنے مالوں کی بھینٹ چڑھائی جا چکی ہے۔ اب بجائے اس کے کہ ان پر مزید چند سال بھینٹ چڑھا کر اپنے آپ کو غضبِ الٰہی کا نشانہ بنایا جائے، سیدھی طرح اُٹھو اور سیکولرازم کے پورے صنم کدے کو توڑ دو، اور خدا کی حاکمیت اور محمدؐ کی شریعت کے علم گاڑ دو!

جو شخص (اور جو گروہ) اس کارنامے کو انجام دینے میں پیش پیش ہوگا ——— وہ عمر بن عبدالعزیزؒ کی مانند ہو، یا سلطان نورالدین زنگی اور سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کی مانند ہو یا اورنگ زیب عالمگیرؒ کی مانند ہو ——— اس کا نام تاریخ کے افق پر مہتاب کی طرح جگمگائے گا۔

یہ کام ہونا ضرور ہے، کوئی بھی آگے بڑھے اور اس سعادت سے بہرہ پائے۔ اس کے مقابلے میں پارلیمانی لیڈری کی واہ وا، چند سالہ یا چند ماہہ حکمرانی کا شکوہ انتہائی بے وقعت ہے۔

اس سلسلۂ گفتگو کا اختتام میں قومی اتحاد سے اپنی ناچیز گذارشات پر کرتا ہوں، کیونکہ پہلی بار قوم کے عوام نے اس سیاسی قوت سے جو اُمید استوار کی ہے کہ اس کا اقتدار نظام محمدی کے قیام کا وسیلہ بنے گا۔ عوام میں اتنی بھرپور اُمید، جس نے "آناً فاناً" ایک ملک گیر تحریک اُٹھا دی، محض اس بناء پر پیدا ہوئی کہ

ملک کے عوام کی مختلف صفوں کو کنٹرول کرنے والی ساری قیادتیں عین اُس مقصد کے لیے جمع ہو گئی ہیں جو ہمارا تاریخی سرمایۂ آمال اور ہمارے مسائل کا بہترین ذریعۂ حل، اور تشکیلِ پاکستان کے اصل مدعا کے حصول کا وسیلہ ہے۔

قومی اتحاد کے لیڈروں کو خصوصاً اور اُن کے پیرو کارکنوں کو عموماً اس بھاری ذمہ داری کو ملحوظ رکھنا چاہیے جو اُن پر پوری قوم کی طرف سے عاید ہو چکی ہے۔ ضروری ہے کہ وہ اس تاریخی لمحے کو پہچانیں جو ہمارے سامنے کھڑا ہے۔ وہ اس وقت کے ممکنات کو سمجھیں کہ وہ پاکستان اور اس کے عوام اور ان کے دین کے لیے کتنا بڑا کارنامہ انجام دے سکتے ہیں۔ خدانخواستہ اگر وہ اپنے لیے اور اپنی جماعتوں کے لیے وزارتوں اور اسمبلی کی نشستوں اور عہدوں کے چکر میں پڑ گئے تو پھر یہ متغامرانہ سیاست اقتدار تو کیا دلوائے گی سرے سے قومی اتحاد کا وجود ہی خطرے میں پڑ جائے گا۔ اور قومی اتحاد کے کمزور ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ساری قوم جو آج صوبائیت اور لسانیت اور فرقوں کی تقسیموں سے بلند ہو کر تحریکِ پاکستان کے دور کی مانند وحدت کا ایک کاروان بن گئی ہے، وہ ایک بار پھر بکھر جائے۔ خدا نہ کرے، اگر ایسا قومی حادثہ ہو جائے تو اُس کی ذمہ داری ان تمام لوگوں پر اس دنیا ہی میں نہیں، آخرت میں بھی ہو گی جو اتحاد کو کمزور کرنے کا باعث بنے ہوں۔ ابھی کچھ نہیں گیا۔ آپ حضرات سر جوڑ کر بیٹھیں اور پہلا فیصلہ یہی کریں کہ مطلوبِ حقیقی کیا ہے، غلبۂ اسلام یا آپ کی جماعت کا غلبہ اور آپ کی اپنی کیبنٹ[1]؟ پھر اگر آپ اسلام کو چُن لیں تو اسلامی تقاضوں

[1] ایک مصیبت یہ بھی ہے کہ اقتدار طلبی کے ساتھ استعجال پسندی بھی شامل ہو جاتی ہے۔ لوگ چاہتے ہیں کہ پہلے ہی ہلّے میں اقتدار ملے، بلا شرکت غیرے ملے یا اس کا حصۂ کبیر (LION'S SHARE) ہاتھ آئے، خصوصاً وزارتِ عظمیٰ کی مسند ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ حالانکہ ملک کے حالات اتنے پیچیدہ ہیں کہ وسائل کی کمی اور مسائل کی کثرت کا حساب برابر کرنے کی کوشش میں بار بار وزارتی نقشے بدل سکتے ہیں اور باری ایسے شخص یا گروہ کی بھی آسکتی ہے، جو خاموش ایک کونے میں بیٹھا ہو یا جسے بالارادہ اقتدار کی باگ ڈور سنبھالنے سے گریز ہو۔ استعجال اور بتھڑدلاپن نہ صرف سیاسی شعور اور قائدانہ بصیرت کی کمی پر دلالت کرتا ہے بلکہ وہ اس بات کی شہادت بھی دیتا ہے کہ کوئی ایسا اعلیٰ مقصد سامنے نہیں جس کے لیے کچھ لیے بغیر بھی عمریں صرف کی جا سکتی ہوں۔ ایسی عامیانہ سیاست کے لیے خدا و مصطفیٰؐ کو بیچ میں لانے کی کیا ضرورت۔ سیدھی طرح روٹی، کپڑا، مکان کا راگ دورِ رفتہ (باقی برصفحہ ۴۸)

ہی کو معیار بنا کر ثانوی حیثیت کے باقی تمام مسائل کو حل کرنے کے لیے منصفانہ فارمولے بن سکتے ہیں۔

ایک ضروری بات یہ ہے کہ جب کوئی نیا مسئلہ نمودار ہو جس پر پبلک میں اظہار رائے کرنا ضروری ہو تو اگر ساری مجلس کو طلب نہ بھی کیا جا سکتا ہو تو کم سے کم تین اصحاب کی ایک ایسی کمیٹی مامور ہونی چاہیے جو مختصر ترین نوٹس پر جمع ہو سکتی ہو اور وہ امکانی حد تک دیگر قائدین کے ساتھ بھی ٹیلیفونی رابطہ قائم کرے اور پالیسی کی لائن طے کر کے سب کو اس سے مطلع کر دے۔ جب تک ایسا نہ ہو تو سوال کرنے والوں سے کہا جا سکتا ہے کہ ہماری پالیسی کمیٹی یا پوری مجلس نے ابھی فیصلہ نہیں دیا، لہٰذا فی الحال کچھ نہیں بتایا جا سکتا۔ اس طرح "جتنے منہ، اتنی باتیں" کا سلسلہ بند ہو جائے گا، نیز روزمرہ مسائل میں بار بار موقف کی تبدیلی کا مظاہرہ نہیں ہونے پائے گا۔

آخری بات یہ کہ اگر بھٹوازم کا طلسم پوری طرح ٹوٹ جائے اور حالات آپ کو کام کرنے کے مقام تک پہنچا دیں تو سب سے پہلے سیکولرازم کے اڈوں اور مغرب زدہ الحاد کیش، اباحیت پسند، اشتراکیت نواز اور مفاد پرست شخصیتوں، خاص طور پر ان میں سے خرانٹ مہرہ بازوں کو ہٹایئے، کیونکہ ان کو غیر مؤثر بنائے بغیر کوئی بڑی تبدیلی ——— خصوصاً اسلام کے حق میں ——— نہیں لائی جا سکتی۔ یہ باتیں ناقدانہ اور ناصحانہ نہیں، بلکہ خیرخواہانہ انداز کی گذارشات ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴) سے زیادہ اونچے سُروں میں الاپیے، ہر ڈھب کے لوگوں کو ساتھ ملایئے، باہر سے کوئی سرپرستی ملے تو اسے بھی شکریہ کے ساتھ قبول کیجیے۔ اور کھل کر کرسیوں کا معرکہ سر کیجیے۔